https://telegram.me/ilmolkitab

ارشادُالحق صاحب

دن اور تاریخ تو اب ٹھیک سے یاد نہیں شاید جولائی ۱۹۳۰ء کا آخری ہفتہ تھا جب میں رئیس احمد جعفری مرحوم اور عبدالمجیب سہالوی کے ساتھ پہلی بار جامعہ آیا۔ اس زمانہ میں جامعہ کی اپنی بستی نہیں بسی تھی۔ قرول باغ میں کرایہ کے مکانوں میں گزر ہو رہی تھی۔ کچھ کوٹھیوں میں تعلیم ہوتی اور کچھ میں طلبہ رہتے تھے۔ ہم لوگ درجۂ خاص میں داخل ہونے کے لیے آئے تھے۔ جامعہ کے بانیوں نے شروع ہی سے دین و دُنیا کی باہم آمیزی اور جدید و قدیم کی ہم آہنگی کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی نے جو دستورالعمل مرتب کیا تھا اس کے سرورق پر نمایاں حروف میں لکھا تھا۔ ”از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد“ اس نقطۂ نظر کے مطابق اگر ایک طرف جامعہ نے اپنے نصاب میں انگریزی اور جدید علوم کے ساتھ عربی اور قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ اسلام کی تعلیم لازمی قرار دی تھی تو دوسری طرف عربی مدارس کے فضلا کو انگریزی زبان اور جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے خاص انتظام کیا تھا۔ ہم لوگ ندوہ سے نکل کر اس کورس میں شریک ہونے کے لیے جامعہ آئے تھے۔ ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ میں کسی ضرورت سے دفتر گیا، وہاں شیخ الجامعہ [ڈاکٹر ذاکر حسین] کے پی۔ اے۔ تفتہ صاحب اور رجسٹرار اور اکاونٹ آفس کے مشترک سربراہ حافظ فیاض احمد صاحب مرحوم کے قریب ایک متین اور سنجیدہ مولوی نما نوجوان نظر آئے۔ مولوی نما اس لیے کہ نئی تراش خراش کے ساتھ چہرہ پر بالوں کی ایک باریک بخیہ بھی نظر آرہی تھی۔ یہ داڑھی کی نمود نہیں تھی بلکہ چابکدستی سے قطع و برید کی غماز تھی، لیکن یہ ”بقیۃ المقراض“ بال بھی مولویت کا شبہہ دلاتے تھے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مولوی نہیں بلکہ چودھری ہیں۔ ان کا نام ارشادالحق ہے، اور یہ جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے ہیڈ ماسٹر اور چھوٹے بچوں کے بورڈنگ ”خاکسار منزل“ کے اتالیق اعلا ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد کالج کے طلبہ کی ”انجمن اتحاد“ کے انتخابات ہوئے۔ محمد حسین صاحب حیدرآبادی

نائب صدر اور امتیاز حُسین صاحب ناظم منتخب ہوئے۔ حُسین صاحب بڑے ہر دل عزیز، مخلص اور خادم خلق تھے۔ جامعہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہیں کے کاموں میں لگ گئے۔ مدتوں مدرسہ ابتدائی اور ثانوی میں استاد اور اتالیق رہے۔ کچھ عرصہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب [مرحوم] کے پی۔ اے۔ بھی رہے۔ اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں میں بے حد مقبول تھے۔ طالب علم انھیں باپ کی طرح سمجھتے تھے اور اُبّو کہتے تھے۔ یہ نام ایسا چلا کہ بڑے چھوٹے سبھی اُبّو کہنے لگے۔ افسوس ہے کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔

نئے منتخب ناظم امتیاز صاحب ڈاکٹر ذاکر حُسین مرحوم کے بھتیجے اور ڈاکٹر مسعود حُسین خاں صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ حُسین صاحب سے بڑی گہری دوستی تھی۔ جامعہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء میں لندن گئے اور بی کام کیا اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں ایک سال کے لیے امریکہ کا تعلیمی سفر کیا۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں معاشیات کے استاد تھے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو وہیں انتقال ہوا۔ علمی کمال کے ساتھ بڑے خوش مزاج اور خوش اخلاق تھے، خلوص اور دوست نوازی تو اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔

بہر حال انتخابات کے بعد مسند نشینی کا جلسہ "خاکسار منزل" میں ہوا۔ اس تقریب میں میرا بھی وہاں جانا ہوا اور بورڈنگ کی صفائی، خوش نمائی اور حُسنِ انتظام دیکھ کر ارشاد صاحب کی انتظامی صلاحیت خوش سلیقگی اور خوش ذوقی کا دل پر بہت اثر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد طلبہ کی تعلیمی نگرانی کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی تو روز ہی آنا جانا ہونے لگا۔ اور اس تاثر میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

اس زمانہ میں جامعہ کے مالی حالات بہت خراب تھے اور یہاں کے کارکن "قدو گیسو" کے بجائے "دار و رسن" کی آزمائش میں مبتلا رہتے تھے۔ لیکن فقر و فاقہ میں بھی ظاہری آن بان کو قائم رکھنا اور تنگدستی میں فراخ حوصلگی اور اولوالعزمی کا مظاہرہ ارشاد صاحب کا شیوہ تھا۔ جشن سیمیں [۱۹۴۶] کے موقع پر میر کارواں ڈاکٹر ذاکر حُسین خاں مرحوم نے اپنے رفیقوں کی تعریف محض برائے بیت نہیں کی تھی بلکہ واقعی ان میں کا ہر شخص اپنے قافلہ سالار کی طرح "نگہ بلند و سخن دلنواز و جاں پُرسوز" کا نمونہ تھا۔ آج اس فراغت کے زمانہ میں اُس عُسرت کے دور کا خیال آتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس پریشان حالی میں کس طرح اقامت گاہیں ایسی صاف و شفاف اور آراستہ و پیراستہ رہتی تھیں۔ غریبی میں امیری کا رنگ بھرنا اس عہد کے کارکن خوب جانتے تھے۔ یوں تو سبھی بورڈنگوں میں آرائش و زیبائش کا اہتمام تھا لیکن ارشاد صاحب کی "رنگا رنگ بزم آرائیاں"

ہمیشہ یاد رہیں گی۔ خیال نہیں آتا کہ کبھی بچّوں کا کوئی سرپرست یہاں سے دلگیر ہو کر گیا ہو۔ جو سیّاح آتا "خاکسار منزل" کی تعریف میں رطب اللسان واپس جاتا اور اس کے اتالیق اعلا کی شان میں قصیدوں کے پُل باندھ دیتا۔

ارشاد صاحب کی نفاست اور خوش انتظامی غالباً ان کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ رودولی اودھ کا وہ قصبہ ہے جہاں کے فقرا بھی شان کج کلاہی رکھتے ہیں، اور صُوفیہ کے آستانے اپنی آرائش و زیبائش اور خوش سلیقگی اور حُسنِ انتظام میں امیروں کی بارگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس فضا میں انھوں نے ۱۹۰۱ء آنکھیں کھولیں پھر طالب علمی کا آغاز لکھنؤ میں ہوا جو اپنی تہذیب و شائستگی کے لیے سارے ملک میں مشہور ہے۔ اور رہنے کا موقع ملا قیصر باغ میں جو شاہان اودھ کی یادگار اور تعلقداران اودھ کی قیام گاہ تھا۔ محمود آباد ہاؤس جس کے ایک حصّہ میں ان کا قیام تھا اُس زمانہ میں مشرقی تہذیب و روایات کا مرکز تھا۔ مہاراجا علی محمد خاں (والی محمود آباد) کو ریاست کے ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی تھی اور بہت سے سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ ارشاد صاحب کو یہاں سیاسی لیڈروں سے شناسائی اور رموزِ سیاست سے آشنائی ہوئی بلکہ کچھ کچھ درون پردہ راز و نیاز کی بھنک بھی کان میں پڑتی رہی۔ ریاست کے منیجر ڈپٹی حبیب اللہ بڑے بیدار مغز اور اعلا درجہ کے منتظم سمجھے جاتے تھے۔ ان کی نگرانی نے انھیں انتظامی ڈھنگ سکھائے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانانِ ہند ایک ہیجانی دور سے گزر رہے تھے، بہت سے اندرونی اور بیرونی مسائل ان کی الجھنوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک طرف بلقان اور طرابلس کی جنگ ان کی بے چینی کا باعث تھی، دوسری طرف ملک کے اندر وہ اپنی ملّی زندگی کو خطرات سے دوچار پا رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں شملہ میں مسلمانوں کے وفد کو وائسرائے نے عنایت و حسنِ سلوک کا جو یقین دلایا تھا وہ اب طفل تسلّی معلوم ہونے لگا تھا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کان پور کے خونی حوادث نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مسلم یونی ورسٹی کے قیام میں جو رخنہ اندازیاں کی جا رہی تھیں اس نے مسلمانوں کی بے اعتمادی میں اضافہ کر دیا تھا، اور سرکار نوازوں اور اعتدال پسندوں کے بجائے حرّیت پسندوں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ لکھنؤ ان تحریکوں کا مرکز تھا۔ یہیں مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ہنگامہ خیز جلسے ہوئے، یہیں ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان معاہدہ ہوا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں طرابلس و بلقان کے سلسلہ میں پُرجوش جلسے ہوئے،

یہیں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد پڑی اور یہیں سے خلافت کی تحریک کا آغاز ہوا۔ لکھنؤ کے قیام کی وجہ سے ارشاد صاحب کو ان تحریکوں کو سمجھنے اور ان جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ مولانا شبلی کی مشہور نظم

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جان کب تک

انھوں نے ایک جلسہ میں خود مولانا شبلی کی زبان سے سُنی تھی۔ مُسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا وہ مشہور جلسہ بھی دیکھا تھا جس کی سرگزشت مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں "حدیثُ الغاشیہ" کے عنوان سے بڑے دلکش انداز میں لکھی ہے۔ اس جلسہ میں مولانا آزاد نے مولانا محمد علی کے تغیّرِ رائے پر ان کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا تھا۔

معشوقِ ما بشیوۂ ہرکس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

ان حالات کے بارے میں مولانا شبلی نے بڑی پُرزور نظمیں لکھی تھیں، چند شعر حسب ذیل ہیں۔

اب کے جو لکھنؤ میں دیکھا گیا سماں سچ پُوچھیے تو مضحکۂ روزگار ہے
دیکھا یہ پہلے دن کہ ہر ایک گوشۂ بساط میدان رزم و عرصہ گہ گیر و دار ہے
اسٹیج پر ہر ایک بپھرتا ہے اس طرح گویا حریفِ رستم و سفندیار ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب بازوے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے
ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں اشاروں میں ادھر فردِ عمل تقسیم ہوتی ہے
طلسمِ چشم و ابرو کے جو اسرار نہانی ہیں نوآموزوں کو ان کی دم بدم تعلیم ہوتی ہے

لکھنؤ کے اس قسم کے جلسوں اور جلوسوں سے ارشاد صاحب کے دل میں سیاست کی تخم ریزی ہوئی اور ملک کی آزادی اور ملت کی سربلندی کا شوق پیدا ہوا۔

لکھنؤ میں اس زمانہ میں مناظروں کا بھی بڑا رواج تھا، کبھی عیسائیوں اور مسلمانوں میں

اور کبھی مسلمانوں اور آریہ سماجیوں میں مباحثے ہوتے۔ لیکن آج کل کی طرح یہ مناظرے مجادلے نہیں بنتے تھے، نہ حرب وضرب کی نوبت آتی تھی، نہ فتنہ وفساد برپا ہوتا تھا، بلکہ محض تفریحِ طبع، لطفِ مجلس اور رونقِ محفل کا سامان ہوتے تھے۔ مولانا عبدالکریم، پادری جوالا پرشاد اور پنڈت دھرم بھکشو کے مناظرے بڑے دلچسپ تھے۔ ارشاد صاحب کو ان مباحثوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ان مباحثوں کی وجہ سے ان کے اندر مذہبی مسائل پر غور کرنے اور اعتراضات کا جواب دینے کی عادت ہوگئی۔ کرسچین کالج میں تعلیم کی وجہ سے ان میں اسلامی عصبیت پیدا ہوئی، لیکن اپنے مذہب کی صداقت پر یقین اور صراطِ مستقیم پر ثباتِ قدمی کے باوجود ان کا دل مذہبی تنفّر سے محفوظ رہا، اور رواداری کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ گئے، وہاں چار سال قیام رہا۔ بی۔ اے پاس کیا تو اعزّہ واحباب بہت خوش ہوئے۔ اس وقت تک انگریزی تعلیم کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ ردولی جیسے بڑے قصبہ میں اِنے گِنے چند گریجویٹ تھے۔ ارشاد صاحب کہتے تھے کہ نانا صاحب کے پاس مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ آزادی کی تحریک تیز ہوتی جارہی تھی، جلیانوالہ باغ کے مظالم نے سارے ملک میں آگ لگادی تھی، ترکی کی شکست کے بعد خلافت عثمانیہ کی قطع وبرید نے مسلمانوں کو بھی بے حد مشتعل کردیا تھا۔ وہ کانگریس کے ساتھ جدوجہد آزادی میں شریک ہوگئے۔ گاندھی جی اور علی برادران کے دوروں اور تقریروں نے ایسا جوش وخروش پیدا کردیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ بچہ بچہ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتا تھا اور ترکِ موالات کا جذبہ عام تھا۔ لوگ ملازمتیں چھوڑ رہے تھے۔ برطانوی مال کا بائیکاٹ ہورہا تھا۔ عدالتیں ترک کی جارہی تھیں اور اجنبی حکومت سے ربط وتعلق کا ہر رشتہ باشندگان ہند کاٹ دینا چاہتے تھے۔

ان حالات میں سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ارتباط کب قائم رہ سکتا تھا۔ ان سے قطع تعلق کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ کے طلبہ بھی متاثر ہوئے۔ اس وقت تک یونی ورسٹی نہیں بن سکی تھی بلکہ الہ آباد یونی ورسٹی کے ماتحت محمڈن اینگلو اورینٹل (ایم۔ اے۔ او) کالج ہی تھا۔ ترکِ موالات کی تحریک کا یہاں بھی کافی اثر ہوا۔ نوجوان کسی اقدام کی فکر میں تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مرادآباد میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اس میں دوسرے قوم پرور لیڈروں کے علاوہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔

علی گڑھ سے چند پُرجوش طالب علم بھی اس کانفرنس میں گئے۔ ان میں ارشاد صاحب بھی تھے۔ وہ اس کانفرنس میں شرکت اور اس کے اثرات کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، اور بہت سی روایتوں کی تردید کرتے تھے۔ علی گڑھ کے یہ طلبہ علی برادران سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ آپ گاندھی جی کو لیکر علی گڑھ تشریف لائیے۔ مولانا محمد علی خود اسی فکر میں تھے، انھوں نے ان کی درخواست منظور کرلی اور کہا کہ تم لوگ جاکر جلسہ کا انتظام کرو ہم کانفرنس کے بعد آرہے ہیں۔ ارشاد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ آکر جلسہ کا انتظام کیا۔ گاندھی جی اور علی برادران آئے اور یونین ہال میں طلبہ کو خطاب کیا۔ ان تقریروں کا بہت اثر ہوا اور کالج کے منتظمین اور حکام کی ترغیب وتحریص کے باوجود طلبہ نے کالج کو حکومت کے اثر سے آزاد کراکر قومی درسگاہ کی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر ذاکر حُسین مرحوم اس وقت ایم۔ اے کے طالب علم تھے اور ضمنی طور پر کچھ پڑھاتے بھی تھے۔ شروع میں انھیں کسی قدر تامّل تھا مگر پھر انھوں نے بھی اس جدّوجہد میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ منتظمین نے بہت کوشش کی کہ طلبہ کو سمجھا بجُھا کر یا دباو ڈال کر اس تحریک سے الگ کریں۔ جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کالج بند کردینے کا اعلان کردیا اور طلبہ کے سرپرستوں کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنے عزیزوں کو لے جائیں۔ جب یہ تجویز بھی خاطر خواہ کامیاب نہ ہوئی اور مولانا محمد علی کی قیادت میں لڑکے جمع رہے تو پولیس کے ذریعہ ان لوگوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بڑی پریشانی کا وقت تھا لیکن تحریکِ ترکِ موالات کا ملک میں بہت اثر تھا، گھنٹوں میں خیمے لگ گئے، کچھ کوٹھیاں کرایہ پر لے لی گئیں اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو نیشنل مُسلم یونی ورسٹی قائم ہوگئی۔ جامعہ مِلّیہ اسلامیہ اس کا اردو ترجمہ تھا جو اس قدر پسند آیا کہ یہی نام رائج ہوگیا۔

اس واقعہ کا سارے ملک میں چرچا ہوا۔ اخبارات نے شاہ سُرخیوں سے یہ خبر شائع کی۔ پنڈت نہرو اس وقت نوجوان تھے مگر آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے، ان کی فہم وفراست اور عزم وہمت کی دھوم تھی۔ وہ طلبہ کے جوش وولولہ کو دیکھنے علی گڑھ آئے۔ اس نئی تعلیمی بستی کو دیکھ کر ان پر بڑا اثر ہوا اور بڑے شاندار الفاظ میں اس کی رپورٹ اخبارات کو بھیجی۔ الہ آباد کے مشہور قوم پرور اخبار "انڈی پنڈنٹ" نے پُرزور انداز میں یہ روداد شائع کی۔ انڈی پنڈنٹ کی سُرخیاں مُدتوں فضا میں گونجتی رہیں۔

جامعہ چار پانچ برس علی گڑھ میں قائم رہی مگر مولانا محمد علی زیادہ دنوں اس کی سربراہی نہ کر سکے۔

وہ تحریک آزادی کے روح رواں تھے، سارے ملک میں ان کی ضرورت تھی بھلا علی گڑھ میں جم کر کس طرح بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن جتنا وقت بھی انھیں ملتا وہ یہاں صرف کرتے اور نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کے جذبات برانگیختہ کرتے اور ان کے اندر نظام کہن کو زیروزبر کرکے ایک جہان نو پیدا کرنے کا ولولہ پیدا کرتے تھوڑے ہی عرصہ میں وہ بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیے گئے، اور دوسال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ جیل سے رہا ہوئے تو کانگریس کی صدارت کی گراں بار ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آگئی۔ ان حالات میں وہ شیخ الجامعہ کے فرائض کس طرح انجام دے سکتے تھے۔ عبدالمجید خواجہ (بارایٹ لا) ان کے بڑے معتمد تھے، وہ شیخ الجامعہ کے منصب پر مامور ہوئے۔ لارڈ حسن حیات مستجل (رجسٹرار) مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر محمد عالم (بارایٹ لا، لاہور) نے بھی کچھ دنوں تک شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دیے لیکن خواجہ صاحب نے کئی سال یہ خدمت انجام دی اور باد مخالف کے جھونکوں میں سفینۂ تعلیم ملی کی ناخدائی کرتے رہے۔ اس زمانہ میں مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد طلبہ کی دینی تربیت اور انھیں اسلامی تعلیم سے واقف کرانے کے لیے کبھی کبھی آیا کرتے تھے، ارشاد صاحب ان حضرات کے درس میں بیٹھتے تھے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا خاص طور سے ذکر کرتے تھے، کہتے تھے کہ مولانا ابوالکلام چند بنیادی مباحث ذہن نشیں کرانا چاہتے تھے تاکہ ان کی روشنی میں اسلام کا پورا خاکہ سامنے آجائے۔ ارشاد صاحب نے باہر سے آنے والے اکابر کے خیالات سے فائدہ اٹھایا لیکن جامعہ کے نظام اوقات کے اعتبار سے ان کے خاص اساتذہ مسٹر عبدالعزیز انصاری، محمد علی شاہ، طاہر ایس محمدی، مولانا محمد سورتی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، مولانا شرف الدین اور خواجہ عبدالحی تھے۔

مسلمانوں کا جوش تو سوڈے کی بوتل کی طرح مشہور ہے۔ خلافت کی تحریک کا بھی یہی حال ہوا۔ کہاں تو ان کا جوش طوفان کی طرح موجیں مار رہا تھا پھر گھٹا تو ایسا کہ اس کا ہلکا سا دھارا بھی مشکل سے کہیں نظر آتا تھا۔ علی گڑھ کی یہ نوزائیدہ قومی درسگاہ انھیں حالات سے دوچار ہوئی۔ ایک ایک کرکے اساتذہ اور طلبہ علی گڑھ اور دوسری سرکاری درسگاہوں کا رُخ کرنے لگے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کی مقرر کردہ مدد رُک گئی، ارکان کی ہمت نے بھی جواب دے دیا اور یہ مشورے ہونے لگے کہ اسے بند کردیا جائے لیکن حکیم اجمل خاں نے اس نازک وقت میں بڑی ہمت سے کام لیا اور ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ وہ اسے علی گڑھ سے دہلی لے آئے اور طبیہ کالج کے قریب قرول باغ میں کچھ عمارتیں کرایہ پر لیکر اس اجڑی ہوئی بستی کو پھر بسا دیا۔

منتقلی کے مصارف کا انتظام گاندھی جی نے کیا۔

جامعہ کو دہلی پہنچا کر عبدالمجید خواجہ صاحب علی گڑھ چلے گئے اور اپنے قانونی مشاغل میں لگ گئے۔ طاہر ایس محمدی صاحب ان کے قائم مقام مقرر ہوئے۔ طاہر صاحب کانگریس کے سابق صدر بدرالدین طیب جی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی قوم پرور اور وطن دوست تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جرمنی میں معاشیات کی اعلا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھا کہ وہ گھبرائیں نہیں، میں عنقریب چند دوستوں کو ساتھ لے کر جامعہ کی خدمت کے لیے آرہا ہوں۔ ان کے اس ہمت افزا خط سے بڑی تقویت ہوئی، تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ دہلی آگئے اور جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکالنے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ حکیم صاحب جامعہ کے مصارف کی فکر کرتے اور ذاکر صاحب تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتے۔ اہلِ علم دوستوں کے ساتھ انھیں حافظ فیاض احمد جیسا منتظم اور ان تھک کارکن بھی مل گیا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ حافظ صاحب کی انتظامی صلاحیت اگر شریکِ کار نہ ہوتی تو فقر و فاقہ اور تنگدستی کے دور میں جامعہ کے شیرازہ کا بندھا رہنا ممکن نہ تھا۔

ذاکر صاحب کو آئے ہوئے ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ حکیم صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس اچانک حادثہ نے سب کو بدحواس کر دیا۔ دہلی لانے کے بعد حکیم صاحب نے جامعہ کی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی، وہ چاہتے تھے کہ طبیہ کالج کی طرح اس کی بنیادیں بھی مضبوط کر دیں۔ ان کے انتقال کے بعد کچھ دنوں بہت پریشانی رہی اور جامعہ پھر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ لیکن نئے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے ڈھارس بندھائی اور مولانا آزاد اور دوسرے قومی رہنماؤں کی مدد سے اس کشتی کو پار لگانے کی فکر کی۔ چند برس میں انھوں نے بھی وفات پائی۔ یہ وقت جامعہ کے لیے بڑا سخت تھا لیکن ذاکر صاحب کی رہنمائی میں قافلہ منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں نے مشکلات و مصائب کے سامنے سپر نہیں ڈالی بلکہ ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کی جو ملک و قوم کے خدمت گزاروں کو عزم و ہمت کا سبق دیتی رہے گی۔ انھوں نے تعلیم ملی کی راہ میں پہلے ہی اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، عہد پر وہ ہمیشہ جمے رہے۔ شروع میں جن گیارہ آدمیوں نے اس دستاویز صبر و رضا پر دستخط کیے تھے ان میں ارشاد صاحب بھی تھے۔ پھر جوں جوں کارواں آگے بڑھتا گیا نئے ایثار پیشہ اس میں شامل ہوتے گئے لیکن "السابقون الاولون" کی فہرست میں یہی گیارہ جانباز تھے (۱) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲) پروفیسر محمد مجیب

(۳) مولانا محمد اسلم [جیراج پوری] (۴) خواجہ عبدالحی (۵) ارشاد الحق (۶) سعید انصاری (۷) حامد علی خاں (۸) شفیق الرحمن قدوائی (۹) حافظ فیاض احمد (۱۰) مولانا سعد الدین (۱۱) ماسٹر برکت علی (استاد ریاضی و سائنس)

ان بلاکشانِ خدمت کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا مگر ان کے پایۂ ثبات کو لغزش نہیں ہوئی، مقصد کے عشق اور کام کے شوق میں وہ مصائب و آلام کے تلخ گھونٹ اس مزے سے پیتے رہے گویا شہد و نبات نوشِ جان کر رہے ہوں۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر یہ شعر زبان پر آجاتا تھا۔

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انسان
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

انھوں نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھایا اور آخر تک وفاداری پر استوار رہے۔ ان پہل کرنے والوں میں اکثر [اب سب کے سب] اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کر گئے ہیں جو اگر پیشِ نظر رکھی جائے تو یہ خاکسترِ افسردہ اب بھی ہم رنگِ شرارہ ہو سکتی ہے، اور جامعہ ملک کی دوسری تعلیم گاہوں کے لیے نمونۂ عمل بن سکتی ہے۔

میں جس زمانہ میں جامعہ میں زیرِ تعلیم تھا (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۴ء) ان دنوں ارشاد صاحب مدرسہ ثانوی کے نگراں (ہیڈ ماسٹر) اور چھوٹے بچوں کے بورڈنگ "خاکسار منزل" کے اتالیق تھے۔ مرحوم اختر حسن صاحب فاروقی اور محمد عثمان صاحب ان کے معاون تھے۔ "بشیر منزل" مولانا سعد الدین صاحب اور سعید انصاری صاحب کے سپرد تھی۔ یہ لوگ باہمی تعاون، خلوص اور حسنِ انتظام میں مشہور تھے۔ ارشاد صاحب کے سلیقہ اور ذوقِ نفاست کی بنا پر ذاکر صاحب نے انھیں ناظمِ آرائشِ بلدہ بھی بنا دیا تھا۔ یہ شعبہ غالباً اوکھلے میں آنے کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ اس تعلیمی بستی کو صاف، پاکیزہ اور خوش منظر بنائے۔ ارشاد صاحب کو اس قسم کے کاموں سے طبعی مناسبت تھی۔ وہ نوک پلک درست کرنے کے عادی تھے۔ انھوں نے ایسی دلچسپی اور تن دہی سے کام کیا کہ اوکھلے کے ویرانہ کو چمن زار بنا دیا۔

ان کے انتظامی جوہر دیکھ کر انھیں مسجل (رجسٹرار) کی اہم خدمت سپرد کی گئی۔ انھوں نے اس شعبہ میں بڑی اصلاحات کیں، دفتر کی نئی تنظیم کی، پرانے کاغذات تلاش کیے، ان کی فائلیں بنائیں اور مفصل فہرست تیار کی۔ مجلسِ تعلیمی، مجلسِ منتظمہ اور انجمن جامعہ ملیہ کے جلسوں کی کارروائی خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کی۔ ان مجالس کی روداد یں ان کے قلم کی لکھی ہوئی اب بھی موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس زمانہ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان

کا دماغ بہت مرتب تھا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں گرامر اور منطق بڑی دلچسپی سے پڑھی تھی، کہتے تھے کہ یہ ترتیب اسی کا فیض ہے۔ وہ عوامی تعلیم گاہوں کے بھی بڑے قائل تھے اور کہتے تھے کہ جو لوگ خصوصی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں ان میں وہ صبر و ضبط اور عوام کے دُکھ درد کو سمجھنے کا وہ شعور نہیں پیدا ہوتا جو عوامی تعلیم گاہوں میں پڑھ کر ہوتا ہے۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لیے وہ ایسے اشخاص کا ذکر کرتے تھے جو عوامی مدرسوں میں شمولیت کے بجائے خصوصی درسگاہوں میں رہے تھے۔ کہتے تھے ایسے لوگوں کے اندر اپنے آپ کو ممتاز سمجھنے کا جذبہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتا۔

رجسٹرار کی حیثیت سے امتحانات بھی ان کی رہنمائی میں ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں ممتحنوں کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا اس لیے لائق اشخاص سے پرچے بنوانے اور کاپیوں کی جانچ کرانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ لیکن ارشاد صاحب کے اصرار کے بعد لوگ مشکل سے انکار کر پاتے تھے۔ اس زمانہ میں رجسٹرار آفس کے لیے آج کل کی طرح وسیع عمارت نہ تھی، نہ بیسیوں معاون و مددگار تھے بلکہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، ایک چپراسی عبدالمجید، ایک اسسٹنٹ شعیب الرحمٰن [جو جامعہ کے رجسٹرار کی حیثیت سے رٹائر ہو چکے ہیں] اور ایک ٹائپسٹ (موجودہ اسسٹنٹ [اب ڈپٹی] رجسٹرار نعمت حسین صاحب بس یہ کُل کائنات تھی رجسٹرار آفس کی۔ لیکن انھیں حالات میں وہ امتحان کا سارا کام انجام دیتے تھے وہ نہ دن کو دن سمجھتے تھے اور نہ رات کو رات، بس ہمہ وقت اسی دھن میں لگے رہتے تھے۔ معلوم نہیں کن کن استادوں اور کارکنوں کو پکڑ پکڑ کر کام لیا کرتے تھے۔ مجھ پر خاص عنایت تھی۔ گھر سے لے کر پریس تک اپنی ہمرکابی میں رکھتے تھے۔ کبھی میں اُکتا کر بھاگنا چاہتا تو گرم گرم فقروں سے ایسی تواضع کرتے کہ تعمیل ارشاد کے سوا اور کوئی راہ نظر نہ آتی۔ نتیجہ مرتب کرنے کے بعد اس پر بار بار نظر ڈالتے، طلبہ کے حال پر بے حد شفقت تھی، کوئی چند نمبروں سے فیل ہوتا یا اس کا ڈویژن خراب ہوتا نظر آتا تو بے چین ہو جاتے، ممتحنوں کو توجہ دلاتے۔ اس کے بعد بھی کچھ کسر رہ جاتی تو مجلس امتحان میں نمبروں کے بڑھانے کی سفارش کرتے۔ کہا کرتے تھے کہ دو ایک نمبروں کی وجہ سے طالب علم ساری زندگی محرومیوں سے دوچار رہے گا، ممتحن کے پاس کوئی ایسا کانٹا تو ہوتا نہیں جس سے وہ رتی ماشہ کی طرح نمبروں کا حساب کر سکے، دو ایک نمبر گھٹ بھی سکتے ہیں اور بڑھائے بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن بعض ستم ظریف ممتحن ان کی درخواست پر اور سخت ہو جاتے تھے۔ جامعہ کالج میں انگریزی کے ایک استاد ٹھاکر اندر پال سنگھ تھے، آدمی

ذی استعداد تھے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب ان کی انگریزی کے معترف تھے اسی بنا پر ان کا تقرر کیا تھا لیکن مزاج میں توازن نہ تھا۔ اکثر کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ بسا اوقات گھنٹے کی آواز نہ سنتے اور درجہ میں نہ پہنچ پاتے۔ کالج کے سابق پرنسپل اعزاز الدین خاں صاحب بڑے قاعدہ ضابطہ کے آدمی تھے، ان کی باضابطگی اس بے ضابطگی کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کی تنبیہ اور باز پرس ٹھاکر صاحب کو کلاس میں پہنچا دیتی تھی لیکن ان کے درس سے طلبہ کبھی مطمئن نہ ہوسکے۔ وہ کہتے تھے کہ بی۔ اے کے لڑکے جب ہائی اسکول کی سطح کے ہوں تو انھیں کس طرح پڑھایا جائے۔ لیکن طلبہ ان کی بے اعتنائی کے شاکی تھے اور کہتے تھے کہ آخر محمد ادریس صاحب بھی تو ہم ہی لوگوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں ہم ان کی بات کس طرح سمجھ جاتے ہیں، ٹھاکر صاحب بھی توجہ کریں تو ان کا سبق بھی سمجھ میں آجائے۔ بہر حال ٹھاکر صاحب اور طلبہ کے درمیان کبھی ہم آہنگی نہ ہوسکی۔ امتحان کا پرچہ بنانے اور کاپیوں کے جانچنے میں وہ بہت سخت تھے۔ پرچے کی سختی تو ماڈریشن کمیٹی میں کم ہو جاتی تھی مگر نمبروں کی تشخیص میں ان کو بلند سطح سے کون نیچے اتار سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انگریزی میں کافی طلبہ فیل ہوتے۔ بعض تو ضمنی کے لائق بھی نہیں رہتے تھے۔ اب تو لڑکوں نے بڑی سہولتیں حاصل کرلی ہیں، لیکن اس زمانے میں ایک مضمون بلکہ بعض اوقات ایک پرچے کی وجہ سے پورا سال برباد ہو جاتا تھا۔ ارشاد صاحب طلبہ کی اس مصیبت سے بہت دلگیر رہتے تھے اور جہاں تک ہوسکتا اس کے تدارک کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم سب مضمونوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب تھا، مگر ٹھاکر صاحب کی وجہ سے اس کا ڈویژن خراب ہو رہا تھا۔ ارشاد صاحب نے مجھ سے کہا اندر پال تمھارے کالج کے رفیق ہیں ذرا ان سے کہو کہ دو نمبر بڑھا دیں اس غریب کی زندگی بن جائے گی۔ میں نے ان سے ذکر کیا، دوسرے دن وہ رجسٹرار آفس آئے اور اس لڑکے کی کاپی لے گئے اور اگلے دن دو نمبر اور کم کر کے دے گئے اور کہا کہ میں غلطی سے زیادہ نمبر دے گیا تھا۔ ارشاد صاحب کو ان کے اس طرز عمل سے بہت تکلیف ہوئی۔ یاد نہیں آتا کہ پھر اس طالب علم کی مصیبت دور کرنے کے لیے انھوں نے اور کیا تدبیر کی لیکن زندگی بھر وہ ٹھاکر صاحب کی اس حرکت کو بھولے نہیں۔

امتحان کے علاوہ انجمن جامعہ ملیہ، مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ کے جلسوں کا انتظام اور ان کی کارروائی کا اندراج بھی انھیں کے ذمہ تھا۔ یہ کام بھی وہ بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے کرتے تھے، شرکاء جلسہ کے ساتھ مناسب برتاؤ، ان کی خاطر مدارات اور ان کی راحت و آرام کا خیال ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ باہر سے آنے والے ارکان ان کے حسن سلوک سے خاص طور سے متاثر ہوتے تھے۔ آج کل کس

ادارہ میں پارٹی بازی نہیں ہے جس زمانے میں ارشاد صاحب رجسٹرار تھے جامعہ میں بھی پارٹی بازی کا خاصا زور ہو چلا تھا، مختلف مکاتیب فکر اور متضاد نقطۂ نظر کے لوگ ان مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ بسا اوقات نوک جھونک کی نوبت بھی آجاتی تھی، لیکن ارشاد صاحب کا سب احترام کرتے اور اختلاف کے عالم میں بھی ان کی دیانت اور غیر جانبداری میں کسی کو شبہہ نہ ہوتا تھا۔ ان مجالس کی روداد لکھنا آسان نہ تھا، جلسہ کے دوران وہ ضروری باتیں نوٹ کر لیتے تھے لیکن شیخ الجامعہ اور شرکاء جلسہ کے خیالات اور مسائل زیر بحث کے سلسلہ میں جو تنقیحات و تشریحات مختلف نقطۂ نظر کے لوگوں نے پیش کی ہوتی تھیں ان کو اس طرح مرتب کرنا کہ صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، نہ کسی شخص کو شکایت ہو، نہ کوئی لفظ غلط فہمی کا باعث بنے، نہ دوسرے زاویۂ نظر کی ترجمانی میں فرق آئے، بڑا مشکل تھا۔ بعض جلسے بڑے طویل ہوتے تھے اور زیر بحث مسائل بہت پیچیدہ اور مختلف فیہ ہوتے تھے۔ ان کی روداد لکھنے میں ایک حرف بھی ادھر سے ادھر ہو جائے تو مفہوم بدل جائے اور بات کچھ کی کچھ ہو جائے۔ ارشاد صاحب پہلے اس کا مسودہ بناتے پھر اس پر غور کرتے جہاں کسی قسم کا شک ہوتا شیخ الجامعہ اور شرکاء جلسہ سے دریافت کرتے پھر اس مسودہ کو بار بار پڑھتے، الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کا خیال رکھتے۔ اسی احتیاط کا یہ نتیجہ تھا کہ ۲۵ برس کی طویل مدت میں کسی کو ان کی ایمان داری، راست گفتاری اور حقیقت نگاری میں کوئی شک نہیں ہوا۔ میں ان مجالس میں سالہا سال شریک ہوا ہوں۔ مجھے کوئی ایک جلسہ بھی ایسا یاد نہیں آتا جس میں ارشاد صاحب کی روداد پر کسی نے اعتراض کیا ہو۔

ارشاد صاحب شروع سے مذہبی آدمی تھے اور نماز روزے کے بڑے پابند تھے۔ چونکہ قبض کے دائمی مریض تھے اس لیے فجر میں بہت کم مسجد پہنچ پاتے۔ ظہر دفتر سے آتے آتے مسجد میں ختم ہو چکی ہوتی تھی (اس لیے یہ دونوں نمازیں گھر ہی پر پڑھتے) باقی نمازیں باجماعت مسجد میں ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ روزے بڑے اہتمام سے رکھتے، تراویح بھی پابندی سے جامعہ کی مسجد میں پڑھتے لیکن آخر عمر میں محلے کی مسجد پر اکتفا کرنے لگے تھے۔ زکات کا ان کا حساب کتاب تو مجھے نہیں معلوم لیکن خیر خیرات سے ایک حد تک واقفیت ہے۔ اہل حاجت کی مدد اور کار خیر میں کافی حصہ لیتے تھے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ حج کی سعادت بھی حاصل ہو جائے۔ کبھی کبھی اس موضوع پر مجھ سے اور سعید انصاری صاحب سے گفتگو بھی کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں ہم لوگوں کا یہ شوق بہت بڑھ گیا اور مغل لائن کو درخواست بھیج دی گئی۔

عبدالرزاق صاحب سابق ہیڈ ماسٹر مدرسہ ثانوی وحال سربراہ مدرسہ البنات جامعہ نگر کے علاوہ سعید صاحب کی اور میری اہلیہ بھی شریک ہوگئیں۔ لیکن قرعہ اندازی میں ہم لوگوں کا نام نہ نکلا اور درخواستیں واپس آگئیں۔ ذاکر صاحب اس زمانے میں نائب صدر جمہوریہ ہند تھے، ان سے اس مشکل کو حل کرنے کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ ان کی خصوصی توجہ سے اجازت مل گئی اور چھے آدمیوں کا یہ قافلہ حج وزیارت کے لیے روانہ ہوگیا۔ حج کا سفر بڑا نازک ہوتا ہے، بعض اوقات عمر بھر کے تعلقات ختم ہوجاتے ہیں اور دوستی دشمنی سے بدل جاتی ہے، اس کی بڑی عبرت ناک مثالیں نظر سے گزر چکی تھیں، اس لیے دل بہت ڈرتا تھا، لیکن اللہ نے فضل فرمایا اور پونے تین ماہ مشترک قیام وطعام کے باوجود تعلقات بدستور شگفتہ رہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک خلوص ومحبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مسجدِ جامعہ کی تعمیر عملاً تو سعید انصاری صاحب کی محنت وجانفشانی کی رہینِ منت ہے مگر اس کی تحریک اور تعمیر کے ہر مرحلہ میں ارشاد صاحب کے مشورے شامل رہے ہیں، اور ان کے عزم بلند اور ہمتِ عالی نے کارکنوں کے حوصلے بلند رکھے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسجد ایسی شاندار اور خوبصورت ہو کہ دہلی کی قابلِ دید عمارتوں میں شمار ہونے لگے، مگر سرمایہ کم تھا اور بظاہر بہت بڑے چندے کی توقع نہیں تھی، ان حالات کی بنا پر طبیعت میں افسردگی پیدا ہوتی اور یہ خیال ہونے لگتا کہ تمناؤں میں الجھے رہنے کے بجائے حقائق پر نظر رکھی جائے۔ لیکن ارشاد صاحب نے جو تصورِ مسجد کا ذہن میں قائم کر لیا تھا اس سے نیچے اترنے کو تیار نہ ہوتے، سعید صاحب بھی ان کے ہم نوا ہوجاتے اس موقع پر کبھی کبھی یہ شعر پڑھتے:

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا وخلق
باشد بقدرِ ہمت تو اعتبارِ تو

مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اللہ نے قدم قدم پر دستگیری فرمائی اور بے سان وگمان جتنی بڑی بڑی رقمیں بھیجتا رہا شاید یہ انھیں کی عالی ہمتی کا اثر ہے۔ "انا عند ظن عبدی بی" (میرے متعلق میرا بندہ جو خیال کر لیتا ہے میں اسی کے قریب رہتا ہوں) اس حدیثِ قدسی کے تاریخ میں بہت تجربے ہوئے ہیں، جامعہ کی مسجد کا تجربہ بھی اس کی صداقت کی ایک مثال ہے۔ ارشاد صاحب پیر روشن ضمیر ہوتے تو یہ ان کا کشف سمجھا جاتا اور صوفی ہوتے تو یہ ان کی کرامت خیال کی جاتی۔ بہرحال اللہ نے ان کی تمنا پوری کر دی اور کارکنوں کو سرمایہ کی قلت کی شکایت

کا کبھی موقع نہیں دیا۔ مجھے اس واقعہ کی بنا پر ان کی عنداللہ مقبولیت کا یقین ہو گیا ہے۔ جس خدا نے دُنیا میں ان کی آرزو بر لانے کا ایسا انتظام کر دیا، کیا عجب ہے کہ اس نے ان کے لیے آخرت میں انعام و اکرام اور عزّت و سرفرازی کے دروازے کھول دیے ہوں۔

مسجد کی تعمیر کا خیال تو اوکھلے میں آنے کے بعد ہی سے ذاکر صاحب کے ذہن میں تھا۔ جب ابتدائی اور ثانوی کی عمارتیں بن رہی تھیں تو جرمن آرکیٹکٹ مسٹر ہائنس مسجد کا بھی بڑا خوبصورت نقشا بنوایا تھا، لیکن ملک کی تقسیم کے بعد قتل و غارت کے ایسے ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ نقشا عمل کا قالب نہ اختیار کر سکا۔ پھر مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری، بہار کی گورنری، جمہوریہ ہند کی نائب صدارت اور صدارت کی گراں بار ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آ پڑیں، اور انھیں اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہ ملا لیکن یہ خیال ان کے دل میں برابر رہا اور اپنے دوستوں، شاگردوں اور نیازمندوں کو وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہے۔ کئی بار مجھ سے بھی ذکر کیا لیکن مجیب صاحب حالات کو نامساعد پاتے تھے اور ڈرتے تھے کہ تعصب اور فرقہ وارانہ کشاکش کی بڑھتی ہوئی فضا میں مسجد کی تعمیر کسی مزید کشمکش کا سبب نہ بن جائے جس سے اہلِ جامعہ مشکلات میں مبتلا ہو جائیں۔ اس بنا پر انھیں اجازت دینے میں تامّل تھا۔ ان کا یہ خیال بالکل بے بنیاد نہ تھا، فضا فرقہ واریت کے زہر سے پاک نہ تھی لیکن خطرہ کوئی ایسا یقینی نہ تھا کہ اتنا ضروری کام روک دیا جاتا۔ ذاکر صاحب کے پُرانے رفقا اور اہلِ جامعہ مسجد کی تعمیر کے متمنّی تھے۔ خود ذاکر صاحب بھی خواہش مند تھے لیکن ضابطہ کی منظوری کس طرح لی جائے۔ ایک دن ارشاد صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم شعبۂ دینیات کے ناظم ہو ایک درخواست لکھ دو، انجمن جامعہ ملّیہ کا جلسہ ہونے والا ہے، میں اس میں پیش کر دوں گا۔ یہ درخواست انھوں نے جلسہ میں پیش کی، ذاکر صاحب نے اس کی تائید کی اور منظور ہو گئی۔ پھر کچھ مدّت مزید دفتری کارروائیوں میں لگی، بالآخر مجلس منتظمہ نے زمین متعین کر دی اور تعمیر کی اجازت دے دی اور اس کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی نے سعید انصاری صاحب کو سکریٹری مقرر کیا۔ سب سے بڑی فکر اچھے نقشے کی تھی، ہائنس صاحب کا نقشہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا، یہ مشکل مشہور آرکیٹکٹ جناب فیاض الدین صاحب حیدرآبادی نے حل کر دی۔ انھوں نے بلامعاوضہ محض رضائے الٰہی کی خاطر نقشا بنا دیا اور نگرانی بھی منظور کر لی۔ مجیب صاحب نے اس نقشے کو پسند کیا ذاکر صاحب نے بھی منظور کر لیا اور اللہ کا نام لے کر اس قلیل سرمایہ سے جو ذاکر صاحب نے ۱۹۴۶ء میں جمع کیا تھا کام شروع کر دیا گیا۔ نیو کھودتے وقت خود فیاض الدین صاحب نے پہلا پھاوڑا مارا

اور ان کے مرشد زادہ [جامعہ کے گریجویٹ] خواجہ حسن ثانی نظامی نے ایک اور پھاوڑا لگا کر ان کے عمل کی تائید کی۔ ذاکر صاحب کو اس کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے ۷ مئی ۱۹۶۹ء کو کارکنوں کو راشٹرپتی بھون بلایا توقع تھی کہ ان سے مفید مشورہ بھی ملے گا اور خاطر خواہ اعانت بھی لیکن افسوس

"آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند"

۳ مئی ۱۹۶۹ء کو اچانک ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے اس حادثہ نے سب کو بدحواس کر دیا۔ لیکن اللہ کے بھروسے پر کام شروع کر دیا گیا اور اس نے ہر قدم پر دستگیری فرمائی اور من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (جو اللہ پر بھروسہ کر لیتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے) کا ایسا مشاہدہ ہوا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اللہ نے وہ سامان کر دیا جو وہم وگمان میں بھی نہ تھا، اب کام کرنے والوں کی آزمائش ہے وہ خلوصِ نیت کے ساتھ اس کارِ خیر میں لگے رہیں تاکہ دُنیا کی سرخروئی کے ساتھ آخرت میں بھی سرخروئی نصیب ہو۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے)۔

ارشاد صاحب کی زندگی ہی میں مسجد ایسی ہو گئی تھی کہ اسی میں نماز ہونے لگی تھی وہ وہاں کی تراویح میں بھی ایک بار شریک ہوئے اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھیں۔ نمازیوں کے عظیم مجمع کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ سنگِ مرمر کے فرش کی ان کی بڑی آرزو تھی، اللہ نے اب اس کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ ان کی روح عالمِ بالا میں خوش ہو رہی ہوگی۔

ارشاد صاحب اپنے معمولات کے بہت پابند تھے۔ ناشتہ، کھانا سیر وتفریح، نشست و برخاست سب کے آداب مقرر تھے۔ صبح اوّل وقت میں نماز پڑھ کر چہل قدمی کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور تقریباً میل ڈیڑھ میل کا چکّر لگاتے۔ اس وقت کے مناظر کی بڑی تعریف کرتے اور اکثر مجھ سے کہا کرتے

"اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں"

شام کی چہل قدمی میں مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ بعد مغرب حافظ فیاض احمد صاحب کے مکان پر عموماً نشست کا معمول تھا، اس موقع پر سعید انصاری صاحب بھی آجاتے کچھ اور احباب بھی جمع ہو جاتے اور عشاء تک دُنیا جہان کے مسائل پر بڑی دلچسپ باتیں ہوتیں۔ حافظ صاحب اس محفل کی جان ہوتے، ان کی گفتگو معلومات افزا بھی ہوتی اور پُر لطف بھی۔ ان کے انتقال کے بعد پھر میرے یہاں نشست ہونے لگی۔ جب تک ارشاد صاحب میں چلنے پھرنے کی

طاقت رہی یہی معمول رہا۔ لیکن پیپر کے حادثہ کے بعد ان کی قیام گاہ پر احباب جمع ہونے لگے۔
آخر عمر میں آنکھوں میں پانی آگیا اور بلڈ پریشر رہنے لگا، آنکھیں تو آپریشن سے ٹھیک ہوگئیں لیکن
بلڈ پریشر پر قابو نہ ہو سکا۔ میں ندوہ کے جلسہ کے سلسلے میں ۱۹ر مارچ ۱۹۷۴ء کو لکھنو جانے
لگا تو ان سے ملنے گیا، نسبتاً حالت کچھ بہتر محسوس ہوئی لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ بیماری کا سلسلہ
بڑھتا جارہا ہے، اور اب بلڈ پریشر کے ساتھ دل بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔ طبیعت خراب ہوئی تو ہولی
فیملی اسپتال میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹروں نے بہتیری کوشش کی لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر
بے بس ہوگئی اور

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اس بیماریِ دل نے دیکھا کام تمام کیا

میں اپنے وطن (تھولینڈی ضلع رائے بریلی) میں تھا کہ اچانک رشید نعمانی صاحب کا خط ملا
کہ ارشاد صاحب خدا کے حضور میں پہنچ گئے۔ زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا اور دل
تھام کر بیٹھ گیا۔

(جامعہ، جولائی، اگست ۱۹۷۵ء)